کے بڑے لوگ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ آئے۔ احمد وہیں موجود تھا۔احمد نے زور سے کہا "ہئي عياشي پيا ڪن ڪارو ڪري ماريو ہنھي کي " (دونوں رنگ رلیان منا رہے تھے دونوں کو کالا کرکے مارو) اس طرح مجمع میں "مارومارو" کا شور گونجنے لگا۔ رخسانہ کچھ سمجھ نہیں پائی اور کانپنے لگی۔ برادری کے ایک بڑے شخص نے رخسانہ کو آخری موقع دیتے ہوئے پوچھا" تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟" جس پر رخسانہ نے کہا" سائیں میں اس شخص کو نہیں جانتی" یہ سن کر چند بڑے لوگوں نے آپس میں خسر پسر کی اور فیصلہ سنادیا۔ شور میں گولیوں کی آواز آنے لگی۔ پہلے اس انجان لڑکے کے سینے پر 3 گولیاں چلائی گئیں پھر معصوم بیٹی کے سامنے رخسانہ پر 3 گولیاں چلادیں۔ دونوں بے گناہ قتل ہوئے اور معاملہ ختم ہوا۔ برادری میں ایک ہفتے کے طویل عرصے بعد کوئی غیرت کے نام پر قتل ہوا۔

ورثہ پیرزادو

Virsa Pirzado

Karachi, Pakistan

اب پورے گھر اور بچوں کی زمہ داری اکیلی رخسانہ پر آگئی۔ فراز نے ملکیت میں ایک گھر ہی چھوڑا تھا کیوں کہ وہ کسان تھا اور گھر والد سے وراثت میں ملا۔ اب رخسانہ سلائی کڑھائی کر کے گزر بسر کرنے لگی۔ صبح اٹھ کر پورے گھر کی صفائی کرنا پھر آس پڑوس کی عورتوں کے کپڑے سینا۔ یہ اس کا روز گار تھا۔

گاؤں والے ایک دوسرے کی مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ کوئی خالہ دودھ دے کر جاتی کوئی باجی ناشتہ لیکر آتی تو کوئی چچیری بہن رات کا کھانا لیکر آتی۔ اس طرح آپس میں بات چیت رہتی۔ رخسانہ اپنے کردار کی وجہ سے پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ مجال جو کسی نا محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ وہ اپنے سلائی کڑھائی کا سامان بھی خود بازار سے لاتی۔ کبھی کسی سے مدد نہیں مانگی۔ اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے جاتی اور سامان لے آتی۔ اس کے اسی کردار پر لوگ اس پر فدا تھے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے بچوں کو سرکاری اسکول میں داخلہ دلوایا۔ جس طرح گاؤں کے امیر گھرانوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تو معاشرے میں اپنا اہم کردار ادا کرتے۔ وہ چاہتی تھی اس کی اولاد پڑھ لکھ کر کچھ بن سکے۔

جب گاؤں میں فراز کے انتقال کی خبر پھیلی تھی تو سب مردوں میں رخسانہ کو حاصل کرنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ سب چاہتے تھے رخسانہ ایک نظر انہیں دیکھے۔ لیکن رخسانہ سنجیدہ اور زمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ شرافت کے اعلیٰ مقام پر تھی۔

ایک دفعہ دن دہاڑے گاؤں کا ایک لچا لفنگا احمد رخسانہ کے گھر میں داخل ہوا۔ رخسانہ چارپائی پر بیٹھے بنائی کا کام کر رہی تھی۔ اتنے میں وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا تو رخسانہ نے زور زور سے پڑوسیوں کو آواز دی۔ گھر ساتھ ملے ہوئے تھے اس لیے پڑوسی جلدی پہنچے اور احمد کو پیٹنے لگے۔ پھر رخسانہ نے ہی اسے چھڑوایا اور معاف کر دیا۔ آئندہ کے لیے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "آئندہ اس طرح میرے گھر داخل ہونے کی غلطی مت کرنا" اس جملے پر احمد کو شرمندگی کے بجائے غصہ آیا۔ اس وقت تو وہاں سے چلا گیا لیکن بدلہ لینے کی ٹھانی۔

کچھ دنوں کے بعد رخسانہ سلائی کڑھائی کا سامان خریدنے اپنی بچی فرزانہ کے ساتھ بازار گئی۔ بازار میں اچانک سے پولیس آگئی اور سامنے ہوٹل پر بیٹھے لڑکے کو پیٹتے اور گھسیٹتے رخسانہ کے پاس لیکر آئے۔ یہاں ایک مجمع کھڑا ہو گیا اور برادری

رہی۔ تم سو جاؤ" آدھے گھنٹے بعد باہر کھڑ کھڑ کی آواز آئی۔ رخسانہ کی اماں اٹھی اور باہر جانے لگی۔ دیکھا تو فراز نشے میں دھت گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ اپنا سر نیچے کرتی ہوئی کونا پکڑ کر چلتی بنی۔ کمرے میں پلنگ پر رخسانہ گہری نیند سو رہی تھی۔ فراز کمرے میں داخل ہوا اور دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔ جس پر رخسانہ جاگ گئی۔ فراز رخسانہ کے قریب گیا۔ رخسانہ نے اپنی گڑیا زور سے پکڑی اور خوفزدہ آنکھوں سے فراز کو تکتی رہی۔ فراز نے زبردستی گڑیا کو کھینچ کر دور پھینک دیا۔ پھر۔۔۔۔ کمرے سے بچی کے چیخنے کی آواز آتی رہی اور ویرانے میں گونجتی رہی۔ لیکن یہ آواز کسی نے نہیں سنی۔۔۔ دوسری طرف ماں کی آنکھ کھلی اور منہ سے بے اختیار بیٹی کا نام نکلا "رخسانہ"۔ تھوڑی دیر سہم گئی پھر اللہ سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔۔۔" یااللہ میری بچی کی حفاظت کرنا"۔۔۔۔

صبح ہوئی۔۔۔ رخسانہ خود کو سمیٹتے ہوئے اٹھی اور جا کر نلکے سے منہ دھویا اور پانی پیا۔ وہ سکتے میں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔ پھر یاد آیا "میری چٹکی" اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور ڈرتے ہوئے اپنی گڑیا اٹھائی اور دوڑتی ہوئی باہر آئی۔۔۔ کافی دیر تک وہ باورچی خانے میں بیٹھی رہی ابھی سوچ میں گم تھی کہ اس کی ماں کھانا لے کر پہنچی۔ ماں کو دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ ماں نے کہا "بیٹا کیا ہوا؟ روتے نہیں! دیکھو میں آگئی نا" ابھی رخسانہ کچھ کہتی کہ ماں نے خاموش کرواتے ہوئے کہا" بیٹا بس بس۔۔۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اب اپنے آنسو پونچھو جاؤ۔ نہا کر صاف ستھری ہو کر آ جاؤ۔ میں تمہارا پسندیدہ کھانا لائی ہوں۔ چانول کی روٹی اور پلی کا سالن" ۔۔۔

کئی سال گزرے۔ رخسانہ گھریلو اور سگھڑ بنتی گئی پھر اللہ نے اسے اولاد سے نوازا۔۔۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ اب رخسانہ جوان ہو چکی تھی۔ فراز اب اتنا بوڑھا ہو چکا کہ بستر سے اٹھنا اور بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ ایک دن رخسانہ جھاڑو دے رہی تھی کے فراز کے کمرے سے زوردار آواز آئی وہ دوڑتی ہوئی گئی اور دیکھا تو فراز زمین پر مردہ حالت میں تھے۔ رخسانہ کی آنکھیں بھیگ گئی لیکن اس بار نہ چیخی نہ چلائی۔ زمہ دارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔۔۔ فراز کو بستر پر لٹایا اور اس کے فون سے اس کے دوستوں کو اطلاع دی جو فوراً گاڑی لیکر آئے اور فراز کے جنازے کا انتظام کیا۔

ہوا۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے؟" وہ وہیں سے برتن دھوتے ہوئے جواب دیتی ہے "ہائے مجھے تو نہیں پتا۔ کیا ہوا ہے؟" اس طرح آپس میں سب مل جل کر رہتے ہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں؟ رخسانہ کی اماں کو فکر کھائے جا رہی تھی۔

آج رخسانہ 12 سال کی ہوئی۔ جنم دن تو خوشی کا دن ہوتا ہے لیکن رخسانہ کی ماں کونے میں آنسو بہا رہی تھی۔ رخسانہ نے آکر پوچھا اماں کیا ہوا؟ تم اداس کیوں ہو؟ آج تو میں ایک سال بڑی ہو گئی۔ کیا خوشی کی بات نہیں؟ ماں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا" خوشی کی بات؟ ہاں بلکل خوشی کی بات ہے۔ آج تمہارا رشتہ لینے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ جاؤ جا کر اچھے سے کپڑے پہنو اور ہاتھ منہ دھو کر صاف ستھری ہو جاؤ" رخسانہ مسکرائی اور کہا"میرا رشتہ! ابھی پرسوں انیلہ کی شادی ہوئی۔ اسے اتنے اچھے کھلونے ملے اور اتنی پیاری گڑیا۔۔۔امی مجھے بھی گڑیا ملے گی نا؟" ماں نے مسکرا کر کہا " ہاں بیٹا سب کچھ ملے گا۔ جاؤ اب تیار ہو جاؤ۔" وہ اچھلتی کودتی تیار ہونے چلی گئی۔

گھر میں مہمان آئے۔ ادھیڑ عمر شخص اور اس کا دوست۔ رخسانہ چائے لے کر آئی اور معصومیت سے پوچھا" آپ میرے لیے کھلونے لائیں گے نا؟" وہ شخص عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا" جتنے چاہو اتنے کھلونے خرید لینا" یہ کہتے ہوئے کھانسنے لگا۔50 سال کی عمر میں دمے کا مرض تعجب کی بات نہیں۔۔۔

وہ دن آگیا جب رخسانہ بیاہی۔ وہ بچی خوشی سے جھوم رہی تھی کہ اسے نئی گڑیا مل گئی۔ اس گڑیا کو رخسانہ نے اپنی دوست بنالیا۔ رخسانہ نے اپنی دوست کا نام "چٹکی" رکھا۔ شادی کی رات وہ اپنی والدہ اور چٹکی کے ساتھ نئے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر ویران۔۔۔ کوئی انسان ذات نہیں۔ بڑا صحن جس میں نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ برابر میں باورچی خانہ جسے "ردھنڑو" کہا کرتے تھے۔ ماں بچی کے ساتھ کمرے میں گئی۔ جہاں ایک چھوٹا ٹی وی تھا۔ تفریح کا واحد سامان جو رخسانہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ رخسانہ تھی تو کمسن بچی لیکن سمجھدار اور سنجیدہ۔ ماں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے رخسانہ کو نصیحت کی۔ "بیٹا! تمہاری شادی جس شخص سے ہوئی ہے اس کا نام فراز ہے۔ تم اسے فراز کہہ کر مخاطب کرنا۔ اور جو بھی فراز کہے ویسا کرنا۔ اس کی ہر بات ماننا اور فرمانبرداری کرنا۔ جس طرح ہمارے گھر میں کام کرتی تھی یہاں بھی ویسا کام کرنا۔ ابھی میں چلتی ہوں۔۔۔ فراز آتا ہو گا" رخسانہ نے فوراً ماں کا ہاتھ تھاما اور کہا "ماں ابھی مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے" اس کے معصوم چہرے پر خوف طاری تھا۔ ماں نے گلے لگا کر کہا "میں یہیں ہوں تمہارے پاس کہیں نہیں جا

This story is basically related to a real life incident. This is not the first time a woman has been killed in the name of honour. It has been happening since ages. The idea reflected to a culture of our society. I tried to put this "Karo kaari" culture in my story to highlight this point.

Qatal Hoa, Insaaf Hoa

میرا شہر، میرا گھر

لاڑکانہ سندھ کے بڑے شہروں میں شامل ہے۔ سندھ سیکیولر اور آزاد سرزمین۔ یہاں کے لوگوں کی زبان جتنی میٹھی ہے اتنے ہی دل صاف اور مخلص۔ لاڑکانہ کے قریب بہت سے چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ گاؤں کے لوگ تو سادہ ہوتے ہیں اور اپنی قدیم روایات کو بڑے لگاؤ سے نبھاتے ہیں۔ حالانکہ دور تبدیل ہو چکا ہے۔ کچھ روایات ترک ہو چکی ہیں اور کچھ بدل چکی ہیں

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب ترقی کی لہر نئی نئی آئی تھی۔ اب بھی لوگ بچیوں کی تعلیم کو عیب سمجھتے ہیں۔ اس دور میں لڑکی 10 سال پار کرے تو والدین کو اس کی شادی کی تشویش ہونے لگتی ہے۔ رخسانہ ایک سیدھی سادی لڑکی جس نے "ا" بھی نہیں پڑھا، گاؤں والے اسے اللہ کی گائے کہتے ہیں۔

صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی سب جاگ جاتے ہیں، زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہوتا ہے۔ اس لیے سویرے سے ہی فصلوں کا رخ کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں جنسی تفریق بلکل بھی نہیں یعنی خواتین بھی مردوں کے برابر فصلوں میں کام کرتی ہیں۔ رخسانہ گھر میں اکلوتی بچی تھی والد صاحب کا سایہ جلد سر سے اٹھ گیا۔ والدہ سوچتی اگر میں بھی مر گئی تو اس کا کون خیال رکھے گا؟ حالانکہ گاؤں میں سب رشتہ دار ہی ہوتے ہیں اور اس دور میں تو سب کے گھر بھی ملے ہوئے ہیں۔ یعنی گھروں کے اندر کوئی دیوار نہیں۔ ایک کے گھر سے آواز آتی ہے "سنو فرزانہ! یہ اللہ رکھے کے گھر اتنا بڑا جھگڑا

بلکہ اس کا تو وجود
ہر شہر میں بکھرا ہوا ہے
ہر شہر اس کا گھر ہے۔۔

1 : کوہاٹ

2: پشتو کا وہ گانا جو کسی جگہ سے کوچ کرنے کو بیان کرتا ہے

3: لاہور

4: ڈیرہ اسماعیل

سیدہ زہرہ علی

Syeda Zehra Ali Dera Ismail Khan, Pakistan

مگر تم کیسے آ سکتے ہو
تم سے تو کوئی رشتہ نہیں میرا
تمہارا آنا بنتا نہیں ہے۔

آخری پڑاؤ

میں اقلیت ہوں
جسے تم کافر کہتے ہو
مگر کیا خدا بھی
کہتا ہے کافر مجھ کو؟

نہیں معلوم
میں کافر ہوں یا تم
یا تم بھی نہیں ہو اور میں بھی نہیں
لیکن یہ کون بتائے گا مجھے
کہ جہاں جاؤں
دُھتکار و پھٹکار سے سواگت ہوتا ہے

گھر چھن گئے
خاندان چھن گئے
ایک جوگی ایک بنجارہ کیا کرے گا
کسی ایک شہر کو گھر کر کے
جس کے واسیوں کے خون سے ہر شہر آباد ہو
اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا

بچے بڑے ہو جائیں تو
مائیں گود سے اتار دیتی ہیں۔۔

تیسرا پڑاؤ

ایک بار پھر گھر چھوٹا
چلتی گاڑی میں دل اسی کیفیت سے دوچار رہا
جس کو بھلاتے
بلکہ کسی خاموش گوشے میں
دفن کرنے کی ناکام کوشش کرتے
خوشی و غم کا
فرق بھی کہیں پسِ پشت رہ گیا

'پھُلاں دا سہرا'[4] کیسے
میرا گھر ہو سکتا ہے
کہ میں وہ اقلیت ہوں
جس کے لہو سے
سارے سہرے رنگین اور معطر ہیں
سانسیں کسی گولی کی امانت کر کے
شاید تب تک زندہ رہوں
جب تلک
کسی ہسپتال کے بیڈ پہ
کرب و تکلیف کی بابت
بند آنکھیں تمہیں دیکھنے کے لیے چیخیں

بوجھل روح اشکبار آنکھ اور
خالی دل کو بہلانے واسطے
شہر باغات[3] بلاوا دے رہا تھا

مارچ کا مہینہ
اور جوبن پہ بہار
مگر جس کا دل کھنڈر ہو چکا ہو
اس کو رنگینئی ماحول سے
بھلا کیا غرض

دن گزرتے، مہینے
اور پھر سال ہوئے
اپنوں کی تصویریں مدھم ہوتے
بس برسیاں یاد رہ گئیں
شہر شہر نہیں گھر بن گیا
خالی پن کم ہوا
آنکھیں ہنسنے لگیں
ماں کی گود جو سکون دے
کچھ ویسا ہی احساس۔۔
مگر کیا خبر تھی
ابھی ایک اور دکھ منتظر ہے
ایک بار پھر کوُچ۔۔
زندگی کمانے کی تگ و دو۔۔

کچھ دیر مزید رک جاؤ
بس ایک آخری نظر
تمہیں اپنے ذہن و دل میں اُتار لوں
کہ پھر کوئی نہ ہو گا
قبر پہ شمع جلانے کو
تمہیں تو گھر اگر بتیوں کی مہک سے
معطر رکھنے کی عادت تھی
اب کون خوشبو بکھیرنے آئے گا
بارش سے پہلے کون
میرے دو گز کے گھر کو
محفوظ کرے گا

جانے کتنی آوازیں کتنی دُہائیاں دی ہوں گی
پیچھے رہ جانے والوں نے
مگر ایک بار جو گاڑی چل پڑی
تو ایسی خاموشی نے آن گھیرا
جیسے دنیا کے آخری سرے کی طرف قدم بڑھاتے
میں واحد ذی روح ہوں
آگے کیا معلوم کیا ہے
ہے بھی کہ نہیں

ایف ایم پہ " بیاکا°° باری°ي"[2]
کفن میں آخری کیل ثابت ہوا

مضافات سے گھر پہ لگا عَلم دِکھا
تو لگا جیسے دل دھڑکنا بند کر دے گا
وہ چھت جس پر بیٹھ کر کبھی دھوپ سینکتے
نانی اماں کو نوحے لکھتے دیکھا
اب اس خالی گھر کو دیکھنے
اس کی بے جان چیزوں کو چھونے
اور کبھی زندہ رہنے والوں کی یادیں
جینے پر بھی پابندی ہے
جب اپنوں کی قبریں بلاتی ہوں تو
شہر بدر ہونا اذیت کی آخری حد ہے
مگر مجھ پہ اس فرقے کا ٹیگ لگا ہے
جس کو سب کافر کہتے ہیں

اے پہاڑوں کے دل [1]۔۔
تم پر آخری سلام
کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا پتھر کر دے گا
تمہاری آغوش میں کچھ اپنے ہیں
ان کا خیال کرنا کہ
اپنی واپسی ناممکنات میں سے ہے۔۔

دوسرا پڑاؤ

مت جاؤ

Brainstorming during the workshop and my personal experiences have played a vital role in my write up. Had I not experienced the circumstances, I might not have related to the topic much.

Parrao **پڑاؤ**

پہلا پڑاؤ

"آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا"
کتنی ہی بار نمبر ڈائل کیا
یہ جانتے ہوئے کہ
جواب دینے والوں نے
قبرستان اپنا گھر کر لیا ہے

کسی کمزور لمحے
اچانک گاڑی آبائی شہر کے رستے ڈالی
اس رستے پر چلتے جانا
جہاں معلوم ہو کہ اختتام پہ منزل نہیں
بلکہ رائیگانی منتظر ہے
کب آسان ہوا ہے
مگر اصل کھینچتا ہے
اپنی مٹی بلاتی ہے

شاری! کب تک چلتا رہے گا میرا شہر ویرانوں میں
یاخدا رحم فرما، اور اثر کر بزرگوں کی دعاؤں میں

شاری مراد

Shari Murad

Karachi, Pakistan

The past and present situation of my city inspired me to write positive and negative things that are going on in my city.

میرا شہر میرا گھر **My City My Home**

میرے شہر کی تر و تازہ ہواؤں میں
پھول کھلتے تھے پُر فضاؤں میں

ہر ایک خوش تھا اپنی ماں کی چھاؤں میں
زندگی گزر رہی تھی انکی دعاؤں میں

نہ جانے کہاں سے اِک طوفاں برپا ہوگیا گھٹاؤں میں
عصمتیں لُٹ گئیں ماں، بیٹیوں، بہنوں کی شاہراہوں میں

میرا شہر ایسا تو نہ تھا، جیسا اب ہے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی، اسکی دلکش فضاؤں میں

جو ماں باپ کل تک درختِ سایہ دار تھے
آج وہ بے بس پڑے ہیں، دوسروں کی پناہوں میں

یہی میرا شہر ہے اور یہی ہے میرا گھر
جسکو برباد کر کے بھی، خوفِ خدا نہ آیا حکمرانوں میں

Sayyara Nayyer Syed سیارہ نیر سید

Birmingham, UK

نہ تھا ہمنوا اپنا ، نہ کوئی عزیز کوئی دوست نہ
اتنے بڑے شہر میں نہ کوئی نظر آیا اپنا

3

جو مشکل گھڑی میں ساتھ دینے کو آتا پاس میں
اس اجنبی شہر میں اس طرز کا ماحول تھا اپنا

اب برمنگھم سے بھی ویسی اُنسیت ہو گئی ہے
سیالکوٹ جیسی اس سے بھی محبت ہو گئی ہے
دل کو بھا گئے ہیں اس کے حسین منظر اپنے
ہمیں رغبت ہو گئی ہے ان گلی کوچوں سے بھی

میرے دل کو سکون دیتی ہیں اب اس کی رونقیں
ہمیں یہاں اب رہنے کی عادت ہو گئی ہے

،میرے اپنے بہت سارے ہیں اب یہاں آباد

مہربان ہو گئی ہے ،قدرت مجھ پہ کچھ اس انداز میں

عمر کے قیمتی لمحات بخشے ہیں اس کو بنانے سنوارنے میں
بہت محنت و لگن سے اس کے خدوخال بدلے ہیں
محال لگتا ہے اب اس سے جدا ہونے کا تصور
ملی جُلی تہذیبوں نے اس کے دن رات بدلے ہیں

ہر رنگ و نسل کے باسی نے کی ہے اس کی نقش نگاری
اس کی کو زین سنواری طرح طرح کے پکوانوں سے

4

سنائی دیتی ہے یہاں پر مختلف زبانوں کی گونج
اب کرنی یہاں پر نئی نسلوں کی آبیاری ہے۔ نیر

پہلا تھا ہوائی سفر یہ میری زندگی کا
اپنوں سے بچھڑنے کا گہرا یہ سبب ٹھہرا

ہونا پڑا سب عزیزوں اور احباب سے یکدم جدا
دور چلے جانا پڑا ان سے چپکے، سے الگ ہو کر،
اپنا گھر، کُل اثاثہ اور زندگی کے بہت حسین لمحے
،سب سے ہی بچھڑ جانا پڑا ہو کے تہی داماں

لے کر بڑا اخلاء اپنی زندگی میں اک اتنا
شاید کبھی نہ لوٹ کر، آنے کا حوصلہ لے کر

1

دل پہ رکھ کے پتھر، سات سمندر پار گئے تھے
،نئی اُمیدیں، لے کر کی اک نئی، انجانی منزل

غم و خوشی کے جذبات کا گھیرا تھا
اک نئے باب کا آغاز کیا تھا ہم نے
اپنے ماضی کے اوراق کو طاق میں رکھ کر
،پاٹ لیا تھا اک صحرا ،وسیع ہم نے

ہیں، وہ سب باتیں وہ سب یادیں آج بھی تازہ
،نہ ماند پڑتی ہیں وہ سب باتیں نہ دھندلاتی ہیں
میرے احساسات میں اک ہلچل مچاتی رہتی ہیں
اکثر وہ سب یادیں ان گزرے ہوئے برسوں کی

،نئے شہر میں آکر دُنیا، نئی تہذیب اک نئی
،انوکھے خواب سجا کر مستقبل کے دل میں
بدلنے کو میں ڈھلنے کو، نئے انداز نئے روپ
،کیسے کیسے ارماں مٹا کر نہ جانے خود کے

The place you live in has a very big role to play in your life .Your family, relatives, loved ones and the place you live in create that safe environment for you to nourish and grow You make friends, you do various activities to enjoy what it has to offer for you. When you grow older you take part in shaping and making it therefore it inspired me to write about the place I have been born and brought up and reflect my feelings of those past memories.

Having lived in Birmingham for 50 years I have witnessed it change tremendously over the years.

Having education in Birmingham and then working here gave me an opportunity to serve the community of Birmingham in many ways.

Those positive experiences have shaped me as a result as much as I have played a part in its development.

That was my city and this is my city too **وہ شہر بھی میرا تھا یہ شہر بھی میرا ہے**

میں نے اُس شہر میں اپنی آنکھ کھولی تھی
میں کھیلی تھی کی مٹی میں جی بھر کے اس
گڈے گڑیا کے بہت سارے کھیل کھیلے تھے
آشنائی تھی اپنی زبان، اپنی تہذیب سے ہوئی
رخ بدلا پھر اک روز تقدیر نے کچھ ایسا
سفر باندھا کوُچ ہم نے کیا اور عزم

I am a big die hard patriot when it comes to my country or my city yet the Nature has made the air flow in a different direction and circumstances are pushing me to move to another country and city in a few months. Hence, as soon as this came to my notice, I knew this was for me and since I already had cluttered ideas in my mind. I was just waiting for a reason to organize them.

جہد روح   Juhd Rooh

کھوئی ہوئی میری ذات زندگی کے نشیب و فراز میں

میں ڈھونڈ ڈھونڈ ہاری اپنی شناخت کو

بھٹکی ہوئی روح ہوں چین و قرار سے دور

جو مل جاؤں کہیں تو با خبر رکھنا

جان مسلسل محو سفر لیکن

سفر وہ جس کی منزل لا حاصل، جہد بے سود

اک شور سا برپا ہے کون ہوں میں؟

بے نام و نشاں جس کی منزل بھی لا مکاں

صندل اسلام   **Sandal Islam**

Rawalpindi, Pakistan

چھٹی کے دن وہ ضد کر کے بابا کے ساتھ ''گاندھی گارڈن'' وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ سارا نے اب اپنی لسٹ پر نظر ڈالی۔ یہاں آتی تھی۔ اُس کی صرف تین خواہشات ہوا کرتی تھیں۔ بڑا سا غبارہ، پشاوری آئس کریم اور ہاتھی کی سواری۔ اُس کے خیال میں اُس کا گھر ہی مکمل جنت تھا، جہاں بابا اور ممی کے پیار کی ہوائیں ہر وقت چلتی تھیں۔ یہاں کم سے کم درخت یہاں'' تو اب بھی سایہ دار ہیں۔ لیکن سب جانور کہاں گئے؟ پاس سے گزرتے چنے بیچنے والے لڑکے سے اُس نے پوچھا یہ کیا ہوتے ہیں؟ ''اور مور، شیر، ہرن، بارہ سنگھا؟ ''وہ جانے لگا۔ ''مر گیا، کب کے'' ہاتھی ہوا کرتا تھا؟ کہاں گیا؟، میرے کو نہیں معلوم کدھر سے آئی ہو تم؟ آسمان سے؟ بھاگو یہاں سے۔ میرا کراچی تو بس اب ایسا ہی ہے۔ اچانک ایک ہجوم کسی کمزور سے شخص کو جوتوں اور لاتوں سے مارتا ہوا، وہاں سے گزرنے لگا۔ اُس لڑکے نے بھی ایک پتھر اٹھا !۔ احمدی کافر'' سالا قادیانی! بھاگ یہاں سے'' کر اُس پٹتے شخص کو کھینچ مارا۔

☆☆☆

سارہ کی تعطیل ختم ہو چکی تھی۔ اپنا سرخ شلوار قمیض اور پرنٹڈ دوپٹہ اتار کر اُس نے سفید لبادہ پہن لیا تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ایک پرانے سے اخبار کا ٹکڑا اڑتا ہوا اُس کے قدموں سے آکر لپٹ گیا۔ سنہ ۷۵ء کا اخبار تھا شاید۔ کل رات ڈیفنس فیز 2 میں ایک بدنام گھرانہ لوٹ لیا گیا۔ خواتین کو بے عزت کیا گیا۔ باپ کو گولی مار دی گئی۔ سینٹ'' جوزف کالج کی طالبہ سارہ شاہ گینگ ریپ کا شکار ہو کر، اُسی وقت فوت ہو گئی۔ ملزمان فرار، تفتیش جاری ہے۔ احمد شاہ کا یہ گھرانہ قادیانی بتایا جا رہا ہے۔

کراچی کے ساحل سے آتی تیز ہوا کا جھونکا، اُس کے ہاتھ سے اُس کا اعمال نامہ جھپٹ کر لے گیا۔ اُسے لگا اوپر عالم ارواح میں وہ اب بھی زندہ ہے۔ جبکہ کراچی اب مُردوں کا شہر ہو چکا ہے۔ مُردوں کا شہر۔ موئن جو دڑو!!!!

Sameena Nazeer

ثمینہ نذیر

Karachi, Pakistan

درمیان میں صحن، اطراف میں ورانڈہ، تین کمرے اور کونے میں غسل خانہ اور پاخانہ علیحدہ_____ میں غلط مکان پر تو دستک نہیں دے رہی؟ مگر نمبر تو وہی ہے۔ اندر سے بچوں کے ہنسنے اور بلند آواز میں انگریزی میوزک سنائی دینے لگا۔ ہم سب بہن بھائی اُس دن اسی طرح سے لوڈو کھیل رہے تھے۔ جب بابا کو کسی نے باہر دروازے پر بلایا اور پھر وہ کس حال میں لوٹ کر آئے تھے۔ یاد کر کے وہ تھر تھر اسی گئی۔ اگلے دن ہی وہ وہاں سے نکال دی گئی تھی۔

اُس نے بے چین ہو کر انٹر کام پر ہاتھ رکھ دیا۔ اندر سے کسی اجنبی زبان میں نام پوچھا گیا پھر گیٹ سے ایک چینی مرد باہر یہ اب چینیوں کا محلہ ہے۔ بلکہ سارا شہر ہی ہمارا ہے۔ تم کہاں سے آ گئیں۔ بھاگو" نکل آیا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا اور گیٹ بند کر لیا۔ اُس کے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ غلط بس میں تو نہیں بیٹھ گئی؟ "یہاں سے

اختری خالہ کے گھر محمود آباد پہنچنے تک سارا شاہ کا بدبو اور تعفن سے برا حال ہو گیا۔ سڑک کے دونوں جانب کوڑے کے ڈھیر نہیں پہاڑ کھڑے تھے۔ زخمی اور بیمار کتے بلبلاں اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔ بچے اسی کوڑا کرکٹ کے درمیان بیٹھے مزے سے کھیل رہے تھے۔ ہر فٹ پاتھ پر لوگ غلیظ اور چیکٹ لباس پہنے تکے بھنبھوڑ رہے تھے۔ اچانک اُس کا پیر ایک گٹر کے ڈھکن پر پڑا اور نیچے پاتال میں اترنے لگی۔

میں سندھی ہوں۔ تو مہاجر ہے۔ میں پنجابی ہوں۔ تم کون ہو؟ مارو مارو! یہ کافر ہے۔ کی آوازیں وہاں گونج رہی تھیں۔ ڈھانچوں کے انبار لگے تھے۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ ایک طرف لڑکیوں کی چھاتیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف اُن کی ران وہ چیختی ہوئی وہاں سے دور دوڑنے "باجی! ران کا گوشت لو گی؟ یا سینے کا؟ قیمہ بنا دوں؟" کا۔ ایک قصائی برہنہ بیٹھا تھا لگی۔ لڑکیوں کی ایک لمبی قطار وہاں لگی تھی۔ عبائیہ پہنی، نقاب پوش عورت لڑکیوں سے ڈگری، گھنگرو، آرٹ برش، قلم اور گٹار لے کر، اُن کے ہاتھوں میں بیلن، چمٹا، فیڈر، حجاب تھماتی جا رہی تھی۔ تم کیا لو گی بیلن کہ ڈائپر؟ سارہ نے وہاں سے بھی رستہ بدل لیا۔

اب اُسے یہاں کئی دروازے نظر آنے لگے۔ ہر کسی پر ایک تختی تھی۔ ٹارگٹ کلنگ، شیعہ سنی فسادات، اغوا برائے تاوان، بچیوں کے ریپ۔ بچوں کے ریپ۔ ڈکیتی۔ لینڈ مافیا۔ اسلحہ فروشی۔ منشیات۔

ایک مرد وہاں کھڑا "کہاں جاؤ گی لڑکی۔۔ فائل دو۔۔ اچھا تمہارا بھی ریپ ہوا تھا۔۔ گینگ ریپ؟ کتنے آدمی تھے؟" سارہ کے منہ سے بمشکل نکلا۔ نہیں۔ وہ سوال "اختری خالہ کی طبیعت کیسی ہے؟ وہ زندہ ہیں؟" مکروہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں کی ہڑتال کے باعث سسک سسک کر مر گئیں۔ بھاگو یہاں سے۔

In the days of world as global village, still everyone connects ones home as a place of comfort, security and growth. City is another home for everyone, and when it's snatched or departed people feel alone. My story is dealing with a similar concept.

موئن جودڑو

Mohenjo Daro

تعطیلات کا اعلان ہوا۔ تمام لڑکیوں نے سفید لبادوں والا یونیفارم اتارا اور چلیں اپنے اپنے شہروں کی طرف جہاں اُن کے گھر تھے۔ ریتو نے ڈھاکہ جانا تھا، اُس نے زرد ساڑھی پہن کر بندیا لگالی۔ بنتو فری ٹاؤن، افریقہ سے تھی، فٹافٹ بڑے چھاپے والا رنگین بُوبُو پہن کر، گھنگھریالے بالوں پر ہمرنگ پگڑ باندھ لیا۔ آنچل، ایلس، عبیر، جمیلہ سب ہنستی ہوئی ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ کسی نے اپنے منگیتر کو دیکھنا تھا۔ کسی نے اپنے بوڑھے والدین کو۔ سارہ پریشان تھی کہ وہ کراچی جا کر کیا کرے گی۔ بے شک اُس کا مکان اب بھی وہاں تھا مگر ہر مکان گھر تو نہیں ہوتا۔ راستے بھر وہ کراچی کے تمام محلوں کی فہرست بنا رہی تھی جہاں اُسے جانا تھا۔ اختری خالہ محمود آباد میں رہتی تھیں، بیمار تھیں جب اُن سے سارہ کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ بریسٹ کینسر ہوگیا تھا انہیں۔ شاید موت کو شکست دے دی ہو۔ شکیلہ آپا کی شادی ہوگئی ہوگی کیا؟ وہ یاد کرنے لگی کہ اُن کا گھر کہاں تھا۔ سارہ کے ہوسٹل میں کوئی فون، ڈاک یا رابطے کی کوئی بھی صورت نہ تھی۔ کتنے برس ہوگئے مجھے کراچی سے گئے؟ پچاس یا بیس؟ یاد کیوں نہیں آرہا؟ اُس کی تو یادداشت مثالی ہوا کرتی تھی۔ سینٹ جوزف کی قابل ترین طالبات میں اُس کا شمار ہوتا تھا۔ سپورٹس سے لے کر، بیت بازی، ڈرامہ کلب اور کوئز تمام میں سارہ احمد شاہ پیش پیش رہتی تھی۔ پھر۔۔

اچانک اُس کا سفر ختم ہوگیا۔ وہ اپنے مکان کے سامنے تھی۔ کیسے بھول سکتی تھی وہ۔ کونے پر جامع مسجد، پھر وہاں سے دائیں ہاتھ تیسری گلی اور پانچوں مکان۔ مگر یہ کیا۔ میرا گھر ایسا تو نہیں تھا۔ اُس کی تو دوسری کیا پہلی منزل بھی نہ تھی۔

یہ تو ماہ جبین تھی جو کسی بھی راہ چلتے سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اس کی جگہ پر رکھ کر سوچتی تو وہ کانپ جایا کرتی تھی۔ صبح کا وہ وقت اسی لیے اسے پسند تھا کہ اس وقت وہ اپنے شہر کو جگمگاتا دیکھا کرتی تھی۔ ہر منفرد شخص کی زندگی سے متاثر ہو کر چند لمحوں کے لیے خود کو اس منفرد زندگی میں محسوس کیا کرتی تھی۔ اور اپنی اوقات یاد رکھا کرتی تھی۔
اپنے سوالات کے جوابات بھی اسے وہیں سے ملا کرتے تھے جہاں سے یہ سوالات جنم لیتے تھے۔ اس لیے کسی جواب کے لیے اسے کھوج نہیں لگانی پڑی۔ ہر انسان کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ جو جیسی زندگی جی رہا ہے وہ اس کا مقام ہی تو ہے۔ یہ تو ہم انسانوں کا فیصلہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو کس مقام تک پہنچانا ہے۔

یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ اس بچی کی کیا مجبوری تھی جو اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے دنیا کی حقیقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کون جانتا ہے کہ اس عورت کو کن مسائل کا سامنا تھا جو اسے اپنے بچے کو لے کر یوں لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑے۔ مگر ماہ جبین اتنا ضرور جانتی تھی کہ کسی پہ انگلی اٹھانے سے پہلے یا کسی کو دھتکارنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے اس کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی جائے تو الزام تراشی اس معاشرے سے ختم ہو جائے۔

Roha Ahmed

روہا احمد

Rawalpindi, Pakistan.

ہر سو پرندوں کی چہچہاہٹ، ہر طرف گہما گہمی، ہر جانب نئے دن کے آغاز کی تیاریوں میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا شور، ہر شخص ان سب سے لاپروہ اپنی ہی دھن میں مگن دکھائی دے رہا تھا۔ جب ماہ جبین کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی نمودار ہوئی۔

دھاگے میں پروئے ہوئے موتیے، گلاب اور گیندے کے گجرے اٹھائے ایک ننھی بچی گاڑیوں کے شیشے بجا رہی تھی۔ صبح کے جلد بازی کے اس پہر میں یا تو لوگ اسے دھتکار رہے تھے یا پھر نظر انداز۔

ماہ جبین کو اس پر بہت ترس آیا اور اس کا دل چاہا کہ اس بچی سے سارے گجرے خرید لے۔ مگر وہ بچی اب اس کی نظروں سے بہت دور جا چکی تھی۔ "بہت مرتبہ انسان چاہ کر بھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا." ماہ جبین کی سوچوں کا تسلسل اور بڑھتا گیا۔ جہاں وہ بچی حلال روزی کمانے کی غرض سے گاڑیوں کے شیشے بجا رہی تھی وہیں سڑک کی دوسری جانب ایک عورت بازو پہ بچے کو اٹھائے لوگوں کے سامنے اپنی چادر پھیلا رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کچی زمین کے ایک ٹکڑے پہ چند جھگیاں بنی دکھائی دیں جن کے باہر خواتین لکڑیوں کے اوپر روٹیاں پکا رہی تھیں۔ جوں جوں وہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی بہت سے سوالیہ نشان اس کے دماغ کو الجھاتے چلے جا رہے تھے۔
کہیں لڑکیاں کھڑی اپنی اپنی سواری کا انتظار کر رہی تھیں تو کہیں کوئی خاتون اپنے بچوں کی سواری خود بنی دکھائی دیتی۔ کہیں کوئی عورت سڑک پر دوکان کھولنے میں مصروف دکھائی دیتی تو کہیں کوئی ورزش کے گرم لباس میں ملبوس عورت کھلے میدان میں ٹہلتی دکھائی دیتی۔

ان سب کی جگہ خود کو رکھ کر سوچنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ ہم ہمیشہ اونچی جگہ پہ خود کو دیکھنے کا تصور کرتے ہیں۔ کون چاہتا ہے کہ وہ نیچے دیکھے، کون چاہتا ہے کہ وہ اپنے سے نچلے درجہ کے لوگوں کی جگہ پر اپنا آپ تصور بھی کرے۔ اسی لئے ہم انسان ناشکرے ہیں کیونکہ ہم کسی کی زندگی کے سخت مرحلے کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

I was inspired to write this story by my thoughts and my daily routine of travelling to university as a day scholar.

Travel towards Garden

سفر گلزا

صبح کا اندھیرا اور مدہم روشنی، کھلے آسمان تلے ہلکے بادل اور ان میں موجود شفق کی سرخی، زمین پہ کہرے کی ہلکی سفیدی اور پھولوں پہ موجود شبنم کے قطرے۔۔۔ کھڑکی پر پڑی اوس ان مناظر کو دھندلا رہی تھی۔ یہ سب ماہ جبین کے لیے کچھ نیا نہ تھا۔ مگر چند لمحوں کے گزرتے ہوئے ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد اپنے دائیں ہاتھ سے شیشے کو صاف کرتی۔

ماہ جبین ایک ایسی شخصیت کی مالک تھی جسے اس کے مزاج سے پہچاننا آسان نہ تھا۔ انتہائی سادہ، خوش مزاج اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنے والی لڑکی، جو لوگوں کی نظر میں تو چلبلی اور خوش اخلاق سہی۔۔۔ مگر اندر سے کتنی سنجیدہ تھی، وہ کیا سوچتی تھی اور اس کا ہر چیز کو دیکھنے اور پرکھنے کا انداز کیسا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔
بس کے چلتے ہی اس نے دائیں طرف لٹکے پردے کو تھوڑا اور کھسکایا۔ درختوں کے بیچ میں سے جھانکتی سورج کی شعائیں اس کے چہرے پر پڑنے لگیں جو اس کو کافی پرسکون کر رہی تھیں۔ مختلف موڑ مڑنے والی سڑک جتنے راستوں کو آپس میں ملاتی تھی اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو اس نے آپس میں جوڑ رکھا تھا۔ اس سڑک سے منسلک ہر شخص کی اپنی ہی کہانی تھی اور ہر جگہ ہر شخص کو دیکھ کر ماہ جبین ان سب کی کہانیوں کو اپنی سوچ سے بن رہی تھی۔ وہ سب لوگ اپنی جگہوں پر اپنا مقام بنا چکے تھے۔
"کیا ماہ جبین کا بھی اپنا کوئی مقام ہے؟" یہ خیال اکثر افراد کو دیکھ کر اس کے ذہن میں عیاں ہوا کرتا تھا۔

جب بھی واپس لوٹتی تو دل میں ایک خیال ہوتا کہ یہ چیز اپنے شہر کو بھی دے دوں. جتنی بار نئے لوگوں میں اٹھی بیٹھی، محسوس ہوا کہ لوگ تو مجھ سے متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ میں ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک سرمایہ بھی بن گئ ہوں اس شہر کی. ایک جھرجھری سی محسوس ہوتی تھی کے لوگوں کو بتاؤں گی تو کیسا سمجھیں گے مجھے، ہائے کس کونے سے آئی ہو جہاں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں. اور پھر لوگوں کا کہنا کہ ہم کیسے آئیں گے وہاں اس چھوٹے سے گاؤں میں. عرصے بعد ایک خیال آیا کہ سخت دھوپ میں جب چھاؤں مل سکتی ہے تو اس چھوٹے شہر کی تنگ گلیوں سے میں باہر کیوں نہیں نکل سکتی؟

اس شہر کی چھوٹی گلیوں میں جب باہر بھاگتی تو لگتا جیسے ٹھنڈی ہوا کی تازگی پورے جسم کو متاثر کر رہی، جب اکیلے گلیوں میں ختم کے میٹھے کی پلیٹیں اٹھائے گھر گھر جاتی تھی تو ایک اپنائیت کی کیفیت محسوس ہوتی تھی، جس نے لوگوں میں گھلنا ملنا سکھایا. چھوٹی چھوٹی تقریبات میں اٹھتے بیٹھتے محسوس ہوتا تھا کہ ہم سب ایک ہی تو ہیں، بس اس پیار کو محسوس کرنے کی دیر ہے.

اب جب دیکھتی ہوں پیچھے مڑ کر تو لگتا ہے کہ ایک لمبا سفر طئے کیا ہے مگر اصل میں تو وہ چند لمحات تھے جو اس چھوٹے سے شہر نے سکھائے. جس نے مجھے ایک طاقت ورلڑکی بنایا. جو آج میں اپنے اس چھوٹے سے شہر کی نمائندہ ہوں اور فخر سے کہتی ہوں کہ اسی چھوٹے سے شہر جیکب آباد سے وہ شخص ہوں جس نے ہر مقام پہ مصیبت کا سامنا کرکے سیکھا کہ میری شخصیت میری مرضی ہے اور میری شہر کی نمائندگی میری زمہ داری ہے. آج عہد پورا ہوا، میں اپنے چھوٹے سے شہر سے متاثر ہو گئ

نمیرہ فیاض

Nameera Fayyaz

Islamabad, Pakistan

I was very inspired by the tag line of the project. Actually whenever I used to travel outside my city, I always saw a gap between myself and other more developed cities people. I always made myself comfortable to engage with them, but I experienced that people were not ready to accept me due to me coming from a small city. This particular programme made me recall all the beautiful memories and the working strategies for my city. This has actually helped me in accepting that the small city of Jacobabad has taught me the moral principles of mingling and accepting every single person coming from any background.

My City My Home میرا شہر، میرا گھر

سخت گرمی کی ٹھنڈی چھاؤں ڈھونڈ کے بیٹھے تو پتا چلا کے ہسپتال سے آواز آئی، مبارک ہو سر، آپکو بیٹی ہوئی ہے. تائی اور تایا دوڑ کے آگے بڑھے اور گود میں لے لیا اور لپک کے اک سیٹی بجائی. اچانک گڑیا نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا. شاید ساز اور دھن شروع سے پسند رہے اسے دکھنے میں اماں کی طرح تھی، گلابی ہونٹ، ہلکی بھنویں، چمکدار گال اور خوبصورت پتلی ناک یہ نہیں جانتے تھے کہ ضد میں بالکل ابا کی طرح ہے، سخت اور اصول پسند. وقت گزرتے ہی میں بڑی ہوگئی، ان تلخ باتوں کو سنتے کہ لڑکی ہے، کیا کر لے گی اس چھوٹے سے شہر میں. جیکب آباد سندھ کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں میری تربیت اور رہنمائی ہوئی. اچھے خاندان میں پیدا ہوجانا صرف خوش نصیبی نہیں تھی اس شہر میں بلکہ ایک مضبوط شخصیت کا بننا بھی ضروری تھا. ساتویں جماعت سے جب شہر سے اکیلے باہر نکلی تو پتا لگا کے باہر کی کھلی فضا میں تو بڑا فرق ہے، شاید تھوڑی پر رونق اور تازہ ہیں لیکن اپنے شہر کی مہمان نوازی اور خلوص کو بھول نہیں سکی.

یہ شہر جو میرا ہے،
اس میں مجھے بھی رہنے دو!
کہیں خاک نہ ہو جاؤں اس تلاش میں،
شہر زندگی میں مجھے بھی جی لینے دو!

نادیہ عمر

Nadia Umer

Lahore, Pakistan

دل کی آبیاری کو محبت چاہیے،
انصاف کا زینہ چاہیے،
تحفظ کی کھڑکی کھلے گی،
تو آزادی کی ہوائیں اس گھر کو مہکائیں گی۔
یہ دل جی اٹھیں گے،
تو شہر جاگ جائیں گے
اگر دل میں احساس اجاگر ہو گا،
محبت کا، تحفظ کا، انصاف ملنے کا،
تو گھر کیا، شہر کیا، یہ جہان میرا ہے۔
زمین میری ہے، آسمان میرا ہے!
وقت آن پہنچا ہے!
جو غاصب ہیں میرے حق کے،
اب ان کو زمین پر گرا دو!
جو وکیل ہیں اس بے انصافی کے،
اب ان کو بھی دھمکا دو۔
جو کھڑے ہیں راہ میری روک کے،
اب ان کو بھی روند ڈالو!
آگے بڑھو اور تھام لو اس حق کو،
وہ حق جو میرے رب کا عطیہ ہے۔
وہ حق جو نہ اس کا ہے اور نہ تیرا ہے
وہ حق جو ہمیشہ سے بس میرا ہے
اس حق کو جو صرف میرا ہے،
میرے پاس رہنے دو!

دل میں گر خوف ہو لٹنے کا،

عزت کے، مال کے، جان کے!

تو کیسے جی پائیں گے؟

کسی بھی شہر میں، کسی بھی گھر میں!

جس کی زمین میں میری خواہشات کی لاش دفن ہو،

جس کی بنیادوں میں میری آزادی کا لہو ہو،

جس کی دیواروں کی اینٹیں میرے جذبات کی بھٹی میں سلگائی گئی ہوں،

جس کی چھت میری بے بسی کی ستونوں پہ اِستادہ ہو،

وہ گھر میرا تو نہیں!

مگر کسی کو یہ احساس ہی نہیں۔

کہ یہ دل مر جائیں گے،

یہ آوازیں گھٹ جائیں گی۔

سانس چلتی بھی رہے،

مگر زندگی کہیں کھو جائے گی۔

شہر خموشاں تو کئی ہیں مگر،

اس شہر کو کیا نام دے پائیں گے؟

اس آگ میں اگر میں دھواں ہو جاؤں گی،

تو یہ شہر اور گھر، سب جل جائیں گے۔

مگر اب بہت ہو چکا!

یہ سلسلہ اب بند ہونا چاہیے۔

اس دل کو بھی ہنسنا چاہیے۔

اس شہر کو بھی بسنا چاہیے۔

اس گھر کو بھی آباد ہونا چاہیے۔

belong everywhere. We need to call this world OUR HOME. Our one big, happy city!

Dil Kay Shehar

"دل کے شہر"

ہم بھی کس قدر سادہ ہیں!
جہاں رہتے ہیں اسے گھر مان لیتے ہیں۔
جہاں سانس لیتے ہیں،
اسے ہی اپنا شہر کہتے ہیں۔
اس نام کے گھر،
اور نام کے شہر کو اپنی پہچان سمجھتے ہیں۔
ہم بھی کتنے سادہ ہیں!
کیونکہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ،
ہم شہروں میں نہیں، شہر ہم میں رہتے ہیں۔
ہم گھروں میں نہیں، گھر ہم میں بسیرا کرتے ہیں۔
ہمارے شہر، ہمارے گھر، ہمارے دل ہیں!
یہ دل گنگنائیں، تو شہر رقص کرتے ہیں۔
یہ دل بولیں ، تو گھر باتیں کرتے ہیں۔
یہ دل اجڑ جائیں ،
تو شہر اجڑ جایا کرتے ہیں۔
یہ دل ویران ہوں، تو گھر سُونے ہو جاتے ہیں۔

I found this topic to be deceptively straightforward. Mere curiosity to delve into its enriching layers made me drown into its complex web, and what I discovered in the end was what makes me as a person. I was able to identify "ME", in the search for the place I can call home. Just like my physical self does not define the whole Me; it cannot sum up my aspirations, longings and fears. Similarly, a physical home is not entirely a HOME unless I connect with it on a deeper, spiritual level. Both the physical and inner selves need to be in sync. with a place to call it our own. One could live in a place for all their lives yet home could be miles away. There are places, cities, communities etc. where you feel connected, appreciated, respected, cherished and emancipated. Those are the places that deserve to be called "Home". We all struggle to find those bases, those homes. That is why the term "feel at home" makes total sense to me now. Moreover, being a woman, why cannot this whole world be my home? Why some places fill us with dread, fear and insecurity? What we seek is the feeling of being welcomed everywhere in this world. A woman does not deserve to feel like a pariah on basis of colour, caste, language, faith, dress code etc. What I wrote is an outrage at crimes against womanhood. It is a tirade against societal oppression, judgement and hypocrisy. This is not solely about women in Pakistan, Bangladesh or UK. This is about every woman wronged or oppressed. This is about "Universal womanhood", because the geographical boundaries divide us but our stories connect us. We share similar fears, dilemmas, struggles, desires and inspirations. We are one. We belong here. This world is ours. We

پھر جب امی نے مجھے لاہور بھیجا لاہور میں زندگی تھی روانی تھی مسکراہٹ تھی ماں جیسی محبت جو ہر کسی کو جوڑ دے۔ پھر مجھے آرکیٹیکچر میں داخلہ ملا تو خوشی اس بات کی تھی کہ یہاں لائبریری ہے خوب کتابیں پڑھوں گی۔ مگر لاہور سے ملاقات ہوتی آرکیٹیکچر نے مجھے زندگی اور لاہور دونوں سے ملوادیا جب شروع میں موسیقی سے ملاقات ہوئی رہی پھر منٹو، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، انتظار احمد، بانو قدسیہ اشفاق احمد سے ملاقات ہوتی گئی لاہور وہ شہر ہے جس نے مجھے اپنے آپ سے بناڈرے ملاقات کرنا سکھایا آرکیٹیکچر کی ڈگری کے تیسرے سال میں جب میرے ڈر ختم ہوئے تو ہر وہ چیز جو میں چاہتی تھی۔ میں نے یونیورسٹی میں ریڈیو پہ لوگوں سے بات کرنا شروع کی۔ مشاعرے میں جاتی تھی۔ لاہور نے مجھ پر اپنی محبت کے دروازے واکر دیئے یہ پہلی دفعہ تھا میں نے مرد کو عورت کے لیئے کھڑے ہوتے بھی دیکھا اور عورت کی بات کچھ حد تک سنی بھی جاتی تھی۔۔ یہاں میلے ہوتے ہیں محبت کی بات تھی۔ لاہور نے مجھے ادبی میلوں میں کبھی بطور اداکار دکھایا اور کبھی بطور مصنفہ۔۔ یوں کہیئے مجھے انسان بنایا

اسلام آباد سے میرا پہلا تعارف نوکری کی تلاش کے سلسلے میں ہوا مگر لاہور کے بعد اس کی خامشی سے ڈر کے میں نے واپس لاہور ہی چنا مگر دوبارہ میری اسلام آباد سے ملاقات اسلام آباد لٹریچر فیسٹول میں ہوئی اس بار بھی اس کی خامشی مجھے ڈرانے لگی پھر میں نے اسلام آباد سے ہر ہفتے ملاقات کا سلسلہ بنالیا یہ سوچ کہ آخر ایسا کیا ہے جو مجھے سے دور ہے یہ شہر اور دو سال مساسٹرز کی ڈگری کے لیئے جاتی رہی تو سمجھ آئی جسے میں نے اپنی نظم میں لکھا۔

عشرت شاہین

Ishrat Shaheen

Pakistan ,Lahore

دوست کوئی نہیں بنایا۔ راستے میں چھوٹے سے تالاب اور بڑے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر گاؤں کے لوگ آتے جاتے دیکھا کرتے۔ سب میرے آنسوؤں میں شریک تھے۔ اگلی طرف اسکول کا خالی گراؤنڈ تھا۔ گھر میں کھڑی بھینس اور بکریاں میری دوست رہی۔

اسکول سے واپس آ کے گھنٹوں ان سے باتیں کرنا عام معمول تھا۔۔ جب گھر میں لڑائی اور مار پیٹ شروع ہوتی تو میں امی کو بچانے جاتی تو مجھے بھی مار پڑ جاتی۔ میرے دوست مجھے زندگی بھر سنتے رہے۔ اسکول جانے سے دو لفظ لکھنا آئے۔

امی کی ایک دوست ماسی حلیمہ جس کی بھٹی تھی اس کے پاس کبھی کبھی دانے بھنوانے جاتی۔

گھروں کے دروازے دوسری گلی میں کھلتے تھے تو آس پاس کے گھروں سے گزر ہوتا۔۔ مگر رسمی سلام دعا کے بعد کوئی زیادہ بات کبھی نہیں کی یا کبھی امی گھر کا سودا لینے بھیجتیں تو چچا خلیل جس کے کریانے کی دکان تھی جو کبھی سودا کے ساتھ کچھ ٹافیاں دیتا تو میرے چہرے پہ مسکراہٹ آ جاتی۔

۔۔ پانچویں کلاس میں لگا کہ امی کو نہیں بچا سکتی، پٹتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی تو سب چھوڑا اور گاؤں اور زندگی سے تعارف بے بسی اور محرومیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔۔ پھر میں نانا کے گھر ضلع بھکر کی ایک تحصیل جہاں میرے نانا ابو رہتے مشہور اور تلوک چند تھے۔ یہ شہر کوئی عام شہر نہیں تھا اسی شہر سے پاکستان کے مشہور لکھاری منو بھائی کا تعلق بھی تھا یہاں مقیم رہے یہ شہر سحرا میں آباد تھا جسے تھل کہا جاتا۔ دریائے سندھ کے کنارے شاعر پاکستان بننے سے پہلے یہاں کے لوگ دین اسلام پہ اتنا عمل کرتے تھے کہ عورتیں ٹوپی والا برقع پہن کے باہر نکلتیں اور گلی کے نکڑ پہ کھڑے لڑکے اور بزرگ پاؤں سے پہچان لیتے کہ یہ کون جا رہی۔

عجیب تضاد تھا گرمیوں میں درجہ حرارت 48 ڈگری تک جاتا اور رات کو دریا کی مٹی کی خوشبو پانی کی آواز راحت جاں بن جاتے۔ نانا کے کے گھر کے ساتھ ہی ایک کچا راستہ جس پہ نانا ابو نے آم کے درخت لگا رکھے تھے دریا کی طرف جاتا اور اس کے نیچے دریائے سندھ بہتا ہے اور بالکل قریب ہی ایک ریت کا ٹیلہ دکھتا جسے 50 فٹ کی دوری پہ دریا پار کر کے دیکھا جا سکتا تھا مجھے وہ کسی کہانی کا شہر لگتا تھا۔ جہاں نئی مخلوق بستی ہو۔ یہ شہر عورت کا شہر نہیں تھا یہ مکمل طور پر مرد کا شہر تھا پاکستان کے کئی شہروں کی طرح جہاں عورت بات کرے تو لوگ کہتے بی بی کوئی مرد ہے تو اس کو بھیجو۔ اس شہر میں عورت محبت بھی کرتی تھی تو برقع کی اوٹ میں۔۔

سویا تو کوئی لمحہ چھوٹ جائے گا۔اس کی مسکراہٹ اور زندہ دلی کا شور اس میں مقیم لوگوں کو اداس نہیں ہونے دیتا۔۔یہاں ڈھول کی تھاپ، محبت اور عقیدت اس کے ہیں۔کسی افسانے ساشہر جسس میں ہر لمحہ کرادر بدل رہے ہیں کہانی بدل رہی ہے مگر یہ کہانی ایک ایسے کرادار کی کہانی ہے جو مضبوط، باکمال،اور ہر لحظہ کسی نہ کسی سُر میں ڈھل کر بھی انفرادی سی حیثیت رکھتاہے۔

یہ ایک انسان جو واقعی انسان بن کر جیتاہے اور کسی مسلک سے دور پر امن اور انسان کا ہمدرد دوست ہوتا۔

وقت کی دھوپ اور گزرے زمانے کی روشنی میں لاہور آج ایک ایسی ماں ہے جس کے بچے جوان ہو گئے ہیں اور وہ ایک جدید زندگی گزار رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں ان کی ماں بھی جدید طرز کے رموز واو قاف اپنالے۔وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ماں بھی یہ چادر اتار دے اور پرانی روایات کو بگاڑ دے۔۔شلوار قمیض کی جگہ تنگ پاجامہ پہن لے بال کٹوادے۔اور وہ ویسا بن جائے جیسے اس کے اپنے بچے چاہتے ہیں اور آس پاس کے لوگ چاہتے ہیں۔کیونکہ ان کو اب پرانی ماں کو اپنے نئے زمانے کے دوستوں سے ملواتے ہوئے شرم آتی ہے۔

میں نے زندگی میں کئی ہجرتیں کیں۔اور ان ہجرتوں کے درمیاں ہر پڑاؤنے میری شخصیت میں اپنا حصہ ڈالا۔

خانہ بدوشی “Khana Badoshi”

زندگی میری زندگی کی شروعات ایک گاؤں سے ہوئی۔جہاں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔
جہاں مخالف جنس کو ظالم اور بے حس پایا۔۔جہاں بہن اور امی کو اکثر مار پڑتی۔ اسکول جانے بھائی کوئی نہیں تھے۔

لاہور سے والہانہ محبت، یہ وہ شہر ہے جس نے مجھے بطور انسان جینے کے حقوق بھی دیئے اور سلیقہ بھی۔۔ مگر پچھلے کچھ عرصے میں میٹر و ٹرین چلانے کے لیئے کئی پرانی تاریخی عمارتیں گرادی گئیں۔۔ تو میں نے تحریر لکھی۔

لاہور اگر انسان ہوتا تو کیسا ہوتا   If Lahore was a Person

میں نے ایک شاعر سے پوچھا کہ لاہور اگر انسان ہوتا تو کیسا ہوتا تو انہوں نے کہا ناصر کاظمی جیسا ہوتا۔ پھر میں نے ایک ماہر تعمیرات سے پوچھا تو انہوں نے کہا میرے لیئے لاہور اب ایک ایسی محبوبہ کی طرح ہے جو بہت خوب صورت ہو جوان ہو مگر اب وہ موٹی بھدی ہو چکی ہو اور جس کے تین بچے ہوں اور تینوں ہی بد تمیز۔

مجھے لگتا ہے انسان اگر لاہور ہوتا تو تو بہت ہی لمبا تڑنگا سا انسان ہوتا مگر اس کا خوب صورت چہرہ کسی افسانے کی محبوبہ کی طرح ہوتا۔ اس کے بھی کئی مخفی کرادر ہوتے جیسے اس کے بارہ دروازے۔ جسے بانو قدسیہ نے عورت کے بارے میں کہا۔ عورت کے دل میں بہت سارے خانے ہوتے ہیں جس میں وہ مختلف محبتیں سنبھال رکھتی ہے۔۔ یہ لاہور کے دروازے بھی تاریخ کے کئی صفحوں پہ جا کھلتے ہیں مگر آپ نو آباد شہر میں رہیں آپ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے یہ کتنا گہرا ہے۔ مگر یہ شہر وہ انسان ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بوڑھا ہونے کی بجائے نئے تجربات کی نذر ہو رہا ہے۔ جیسے انسان کے بال سفید ہونے لگے تو وہ انہیں رنگنے لگے۔۔ وقت کے گہرے نشان نظر آتے ہیں مگر اس شہر کے عاشق جوانی سے لے کے اب تک ویسے ہی ہیں۔ جیسے لکھاری ٹھنڈی سڑک، چیرنگ کراس، مال روڈ کا ذکر کرتے ہیں۔۔ یوں لگتا ہے محبوب کی زلف کا تذکرہ سر عام کیا جا رہا ہے۔۔ یہ میلوں، ادبی لوگوں، سُر ساز، سنگیت، اور محبت کا شہر ہے۔۔ میں نے اس شہر کا نام محبت رکھا۔ یہ ایک انسان جو اپنے مساکین کے ہر رویے پہ محبت بانٹ رہا ہے۔۔ جیسے صابر شفیق باپ اپنی ذات سے عاری اور ماں کی ممتا کو سموئے ہوئے ہے۔۔۔ وقت تو گزرا ہے اس پہ مگر نحیف نہ ہوا یہ آج بھی رات کو جاگتا ہے اپنی پوری سچائی لیئے۔۔ جو واقعی میں اس سے ملنا چاہیں وہ رات کی روشنی میں آ ملیں۔۔ لاہور تو یوں جاگتا ہے جیسے

اسلام آباد میرا شہر ہے اور مجھے اپنے شہر سے محبت ہے۔ محبت کا ثبوت متفکر ہو کر دیتے ہیں تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے میں محبت کا دعویٰ کروں لیکن اپنے شہر کی پرواہ نہ کروں؟ مجھے اسلام آباد کا شہری ہونے پر فخر ہے۔
اللہ میرے شہر کو ہمیشہ سلامت اور شاداب رکھے (آمین)۔

Habiba Rehman حبیبہ رحمان

Islamabad, Pakistan

میں کچھ ان لوگوں کی بھی ہیں جو اسلام آباد کے تصور میں آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں میں آباد تھے۔ میں نے شاید اسلام آباد کو ان لوگوں کی طرح شہر میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھا، لیکن میں نے اس کی تزئین و آرائش کو ہوتے دیکھا، مثلاً اس کی طویل سڑک 'کشمیر ہائیوے' کو وجود میں آتے دیکھا، اس کی اونچی ترین عمارت کو بنتے دیکھا، بازار نما بازاروں سے خریداری کے لئے شاپنگ سینٹر بنتے دیکھے۔

اسلام آباد کو لوگ اس کی قدرتی مناظر اور ہریالی کے لئے جانتے ہیں مگر اسلام آباد مذہبی اور صوفی لحاظ سے بہت جانا جاتا ہے، یہاں ایشیا کی بڑی مسجد یعنی فیصل مسجد محل وقوع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پہاڑیوں میں دربار اور مزار موجود ہیں جہاں ملک بھر سے لوگ آتے ھیں۔ اسلام آباد کی پہاڑیاں یعنی 'مارگلہ ہلز' سیاحت کے لئے بہت مشہور ہیں، ان پہاڑیوں میں ریستوران ہیں اور پتھریلی گزر گاہ، جسے مقامی لوگ کوہ پیما کی طرح تفریح کے لئے طے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں میوزیم، پارک، چڑیاگھر جیسے مقامات ہیں جہاں لوگ آتے ہیں اور یادیں سمیٹتے ہیں۔ اسلام آباد کی سب سے دلفریب چیز اس کی مسحور کن شامیں ہیں۔ جب لمبی سرمئی قالین نما سڑکوں پر پیلی روشنیاں چمکنے لگتیں ہیں (یعنی کہ بجلی کے کھمبے سے سڑک کو روشن کرنے والے چراغ) اور آفتاب غروب ہو کر افق کو پہنچ جاتا ہے تو اسلام آباد اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ مون سون میں اسلام آباد کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ہر سبز چیز کو نیا سبز رنگ لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ہر چیز مزید خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ اسلام آباد کی شامیں ہمیشہ میرے لئے ایک خوبصورت یاد رہیں گی۔

اسلام آباد کی خوبصورتی اس کے گھنے پیڑوں اور قدرتی مناظر میں ہے۔ تو مستقبل میں ہمیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے اور مزید درخت لگانے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میرے اپنے شہر کے لئے یہی خواب، آرزو اور تمنا ہے کہ یہ ہمیشہ یوں ہی پر رونق اور شاداب رہے اور مزید لوگ اس کے نام سے واقفیت رکھیں۔

ہر شہر کی اپنی رونق اور روح جیسا جذبہ ہوتا ہے۔ کچھ شہروں کی قدیم عمارتوں میں، کچھ کی موسیقی کی دھنوں میں، تو کچھ کی اس کی ثقافتوں میں لیکن میری رائے ہے کہ لوگ ہی ویرانوں کو آبادیوں میں بدلتے ہیں تو اسی لئے لوگوں سے اور شہریوں کے برتاؤ سے ہی شہر یاد کیے جاتے ہیں کیونکہ اگر شہری ہوں گے تو ہی موسیقی کی دُھنیں شہر میں سنائی دیں گی، شہری ہوں گے تو عمارتیں کھڑی ہوں گی، شہری ہوں گے تو ہی فن کے کرشمے نظر آئیں گے۔

I have always wanted to express my thoughts about my city so this was a great opportunity

My City My Home **میرا شہر میرا آشیانہ**

یہ الفاظ ایک لڑکی کے نظریات کے نام جس نے سولہ سال ایسے شہر میں گزارے جو کسی آشیانے کے مانند ہے۔ چڑیا تنکا تنکا اپنی چونچ میں دبا کر آشیانے کو شاخ پر کھڑا کرتی ہے جیسے سوئی والی سلائیاں ایک ایک کر کے کپڑے پر گل کو تشکیل دیتی ہیں۔
گھر کے لغوی معنی تو پناہ گاہ ہیں لیکن اگر اس دو الفاظ پر مبنی لفظ پر غور کیا جائے تو اس کی تشریح اتنی محدود نہیں کیونکہ ہم انگریزی میں ان لوگوں کیلیئے بھی تو لفظ گھر کا ہی استعمال کرتے ہیں جن سے محبت کرتے ہیں۔ تو گھر کہاں ہے؟ آیئے میں آپ کو اپنے تجربات سے سیکھے گئے مطلب سے روشناس کراتی ہوں۔

بچپن میں جماعت میں ہر طرح کا کھلونا موجود تھا لیکن پھر بھی میرا اسکول میں دل نہیں لگتا تھا حالانکہ اسکول کی ہر در و دیوار رنگ برنگی تھی تاکہ بچے اس طرح کی چیزوں کو دیکھ کر دل بہلا لیں لیکن پھر بھی گھر کی طرح کا سکون نہ تھا ۔اب گھر بھی اینٹوں کا اسکول بھی مگر ایسا کیا تھا؟ گھر جیسا محفوظ احساس نہ تھا۔

'تعلق' ایک جذبات سے بھرا لفظ ہے۔ پھول کو توڑ کے کسی بھی گل دستے میں لگا دیں، پیداوار تو وہ اسی پودے کی رہے گی جس سے اس پھول کو پتیاں، رنگ اور پتیوں میں رچی بسی خوشبو ملی۔ تو میرا تعلق بھی وہیں سے ہے جہاں کے لوگوں میں، میں رہتی اور کھلتی ہوں۔
میرا شہر اسلام آباد ہے اور اس شہر نے مجھے خزانے کی تجوری دی ہے جس میں میری بہت سی یادیں ہیں جو کسی جواہر سے کم نہیں۔ اسلام آباد پاکستان کا دارالحکومت ہے اور دنیا کے خوبصورت ترین دارالحکومتوں میں ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ اسلام آباد سیر و تفریح کے لئے بہترین شہر ہے اور سہولیات سے لبریز شہر بھی۔ اس شہر میں بہت سی کہانیاں ہیں جن

ریلوے اسٹیشن تک جاتے جاتے میں نے اس شہر کے ہر منظر کو بڑے غور سے دیکھا۔ جن گلیوں میں 'میں اپنے آبائی شہر سے زیادہ اپنائی گئی تھی۔

یہاں سے جاتے جاتے میرے لئے یہ طے کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ میں واپس 'اپنے شہر اپنے گھر' جارھی ھوں یا 'اپنے شہر اپنے گھر سے' جارھی ھوں۔

عائشہ حسن

Aisha Hassan

Lahore, Pakistan

باتوں باتوں میں ہم نے کافی بھی ختم کرلی تھی۔ اتنے میں ہمیں کمرے میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔ آنا ایک دم سے بو 'لی۔ "!اوہ سنوکی
میں ہنسنے لگی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ سنوکی تھی (آنا کی پالتو بلّی)۔

میں جب بھی اپنے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا بھی کھلا چھوڑ دیتی۔ سنوکی محترمہ جھٹ سے میرے بستر پر براجمان ہو جاتی اور تب تک چلاتی رہتی جب تک میں اسُ کی اس شرارت اور کھیل کا حصہ نہ بنتی۔

میں نے جب پہلی مرتبہ سنوکی کو دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ ہمارے ہاں تو لوگ ایسی بلّی کو دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔

مگر کچھ ہی دنوں میں 'میں جان گئی کہ میں آنا کے نہیں 'سنوکی کے اپارٹمنٹ میں رہنے آئی ہوں۔
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں بھی سنوکی سے مانوس ہونے لگی۔

میں یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ مجھ میں اور اس میں صرف جنس کا فرق ھے۔ اپنی کھیل مکمل کرنے کے بعد سنوکی باہر چلی گئی۔

میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اندر آتی ہوئی مدھم سی روشنی میں کھڑے دیومالائی درختوں کو دیکھتے دیکھتے کب سوئی اور کب جاگی پتا ہی نہیں چلا۔

ہم نے ھلسنگ بوائے سینٹرل اسٹیشن کے لیے ٹیکسی منگوائی۔ آنا اور میں 'میرا سامان اپارٹمنٹ سے باہر لے جانے لگے۔ میں نے پیچھے مڑ کر ایک نظر پھر اپارٹمنٹ کو دیکھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سنوکی اس کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔

میرے آبائی شہر میں پٹھان عورت کو 'بو بو جی'
کہہ کر پکارا جاتا ھے۔ جس کے معنی پردہ دار عورت کے ہیں۔ مطلب یہ کہ میں نے پیدا ہوتے ہی اپنے جسم پر اپنا اختیار کھو دیا۔

سو میں نے برسوں سے اوڑھی ہوئی جھجھک اتاری اور سوئمنگ کاسٹیوم پہن لیا۔ سمندر میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور میں طلوع ہو رہی تھی۔

آج میں اُن تمام محرکات کو اور اچھے سے سمجھ پائی، جن کی وجہ سے ہم اپنے ہی وجود کو برداشت نہیں کر پاتے۔

انیسویں صدی میں سامراجیت اور استعمار گری کے جسمانی خدوخال کے حوالے سے پھیلائے جانے والے احساس کمتری کے نظریے نے دنیا کی کسی ثقافت کو نہیں بخشا۔ مگر در حقیقت آزادی اور خوشی محسوس کرنے کا حق ہر جسم کو یکساں حاصل ہے۔

سمندر کی لہروں کو میں اپنی ٹانگوں پر آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ میں اُن گزرے ہوئے پلوں میں ڈوبی ہوئی اپنے موبائل پر تصاویر دیکھ رہی تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ آنا تھی (میری ہاؤس میٹ.) اور ہم دونوں باورچی خانے میں کافی پینے چلے گئے۔ اسُ اپارٹمنٹ میں میرا آنا کے ساتھ سب سے زیادہ وقت باورچی خانے میں ہی گزرا۔

ہر بار کی طرح آنا نے کافی بناتے ہوئے سگریٹ سلگالی جسے وہ پیار سے 'سگی' کہا کرتی تھی۔ مجھے باورچی خانے کی صفائی کو لے کر آنا پر بہت غصہ آیا کرتا تھا۔

ہفتے کی شام اکثر اوقات ہمارے اپارٹمنٹ میں پارٹی ہوا کرتی تھی۔ جس میں آنا کئی لیٹر وائن پینے کے بعد گھر کو اسٹور روم میں تبدیل کر دیا کرتی ۔

مگر اگلے دن میرے ڈر سے پورے ہفتے کی لانڈری اور ٹریش کی ذمہ داری بڑی ایمانداری سے نبھایا کرتی تھی۔

کافی بنانے کے بعد اسُ نے ایک کپ میرے سامنے رکھ دیا اور اپنی کافی کا کپ لے کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی کہ سوچ کے اعتبار سے میری وابستگی اسُ کے علاقے سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔

مگر میری رائے میں ہر انسان کی جگہ وہی ہے جہاں وہ کھل کر سانس لے سکے۔ پھر خواہ اسے اس بات کا ادراک ہو یا نہ ہو ۔

My composition is inspired by the suffocation of the tribal culture, which I have experienced myself.

Therefore when I gave thought to the term 'My City My Home', I started looking upon my town where my self esteem was hurt many times and about the other places where I got healed. I penned down what I went through.

My City My Home

میرا شہر، میرا گھر

آج میرا اس اپارٹمنٹ میں آخری دن تھا۔ میں بار بار فلائٹ انکوائری کر رہی تھی کہ شائد جیسے پہلے کووڈ کے چلتے میری دو فلائٹس کینسل ہو گئیں تھیں. یہ بھی ہو جائے 'اور میں کچھ اور وقت ہلسنگ بوائے میں گزار سکوں۔ میں یہاں فروری کے مہینے میں آئی تھی جب یہ شہر سرمئی آسمان 'غیر متوقع بارش اور نا قابل برداشت ہوا کی وجہ سے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ مگر میں نے اس شہر کو بیوہ سے سہاگن ہوتے دیکھا۔ جب میں پہلی مرتبہ جون کے ابتدائی ہفتے میں ساحل سمندر پر گئی تو میں نے لوگوں کو وہاں کافی حد تک جسمانی خدوخال سے بے پرواہ پایا۔

نیدرلینائی علاقوں میں ظاہری زیبائش کا خبط مغربی یورپ کی نسبت کم پایا جاتا ہے۔ یہاں ماضی میں نسوانی حقوق کی آزادی کے لئے بہت سی تحریکیں چلائی گئیں۔ جن میں ریڈ سٹاکنگ قابل ذکر ہے۔ اسی تحریک کی وجہ سے آگے چل کر یہاں کی عورتوں کو قانونی طور پر آزادانہ طریقے سے اسقاط حمل، زچگی کے لئے چھٹی، اور تنخواہ میں برابری کے حقوق حاصل ہوئے۔

سوئمنگ کوسٹیوم پہننے سے پہلے میں نے اپنے اندر ایک جھجھک محسوس کی۔ ایک پل کو 'میں اپنے آبائی شہر پہنچ گئی۔ جہاں مجھے پندرہ سال کی عمر میں بڑی سی چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔
یہ کہہ کر کہ پشتون عورتیں پردے میں رہتی ہیں۔